www.HallaGulla.com

# ندیم کی غزلیں

احمد ندیم قاسمی

Virtual Home
for Real People

اپنے محبُوب بھائی

فتح محمد ملک

کے نام

# لوحِ خاک

www.HallaGulla.com
Virtual Home for Real People

# فہرست


۱۔ مرے لیے مرے غم ہی خدا کی رحمت ہیں

۲۔ آئینے میں بھی وہ حیرت نہ رہی

۳۔ دل میں محبّت درد کے پیڑ اُگاتی رہی

۴۔ شفق غبار بنی اور کوچ کرنے لگی

۵۔ ایک بار پھر ہم کو حکمِ انتظار آئے

۶۔ طلوعِ صبح کا الزام میرے سر آیا

۷۔ شامِ فراق ایک عجب تجربہ ہوُا

۸۔ خدا تو خدا ہے، بشر نہیں ملتا

۹۔ کہنا چاہوں مگر اے کاش کبھی کہہ پاؤں

۱۰۔ بارش کو بلا رہا ہوں کب سے

۱۱۔ بھلا کیا پڑھ لیا ہے اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں

۱۲۔ کائناتوں کے تماشائی تھے

۱۳۔ آخرِ کار ہم انجامِ سفر تک پہنچے

۱۴۔ مجھے دکھ یہ ہے کہ بہار میں بھی طیور بے پر و بال ہیں

۱۵۔ یوں تو ہر دور میں ڈھالے گئے پیکر کتنے

۱۶۔ تیری گفتار میں تو پیار کے تیور کم تھے

۱۷۔ خزاں نصیب میں، رشتہ مگر بہار سے بھی

۱۸۔ اِک محبتّ کے عوض ارض و سما دے دوں گا

۱۹۔ کسی لاعلاج رجائی نے یہ خبر چمن میں اڑائی ہے

۲۰۔ کام ہی کیا ہے مسافر کو گزرنے کے سوا

۲۱۔ عرش سے سچ کی ہدایت بارہا ملتی رہی

۲۲۔ بھرم غزال کا جس طرح دم کے ساتھ رہا

۲۳۔ انساں ابھی شہ پارۂ ارژنگ نہیں ہے

۲۴۔ دستگیری کر، اے زبانِ جمال

۲۵۔ زندگی غیر کی سوغات نہ ہو

۲۶۔ لچک سی جیسے لپکتی ہوئی صدا میں پڑے

۲۷۔ کچھ نہ تھا زیست کے صحرائے بلا سے آگے

۲۸۔ میری پہچان نمازیں ہیں نہ تکبیری ہیں

۲۹۔ دل میں اب درد مچلتا ہی نہیں

۳۰۔ یہ غم نہیں کوئی پتّھر ادھر بھی آئے گا

۳۱۔ کِتنے طلسم عشق کی نادانیوں میں تھے

۳۲۔ ان زمینوں میں شجر کاری نَو ہے درکار

۳۳۔ بے شمار انسان ہیں، سب کا سراپا ایک ہے

۳۴۔ دُکھ سب کو خود اپنی ذات کا ہے

۳۵۔ کچھ گھبرایا گھبرایا سا لگتا ہوں

۳۶۔ پیماں جو بندھ رہے ہیں، کوئی سُن رہا نہ ہو

۳۷۔ مداوا جس کا ہونے لگا آہستہ آہستہ

۳۸۔ جانے کس سمت سے آیا ہوں، کدھر جاتا ہوں

۳۹۔ بگڑ کے مجھ سے، وہ میرے لیے اداس بھی ہے

۴۰۔ مرے سوال کا یارب! کوئی جواب ملے

۴۱۔ نہ جانے ترجماں ہیں کس قیامت کے اشاروں کی

۴۲۔ عشق میں ضبط کا یہ بھی کوئی پہلو ہوگا

۴۳۔ زیست آزار ہوئی جاتی ہے

۴۴۔ پیار کے دائرے کو تنگ کروں

۴۵۔ زہر کے بعد جو شرمندۂ تریاق ہوئے

۴۶۔ ہر سمتِ چمن ماتم ہوا ہے

۴۷۔ کون کہتا ہے کہ تجھ سی کوئی صُورت نہ ملی

۴۸۔ ہونٹوں پہ تبسّم لانے کو ہم کتنے خراب و خوار ہوئے

۴۹۔ عجب جہانِ طلسمات میرے اندر تھا

۵۰۔ عجیب رنگ ترے حسن کا، لگاؤ میں تھا

۵۱۔ سطح پر آج تو پتّھر بھی اُبھرنا چاہیں

۵۲۔ کبھی ہیرے، کبھی پکھراج میں ڈھلنے والے

۵۳۔ میری محدود بصارت کا نتیجہ نکلا

۵۴۔ اتنا دشوار نہیں موت کو ٹالے رکھنا

۵۵۔ اپنے ماحول سے تھے قیس کے رشتے کیا کیا

۵۶۔ بچھڑ کے بھی مَیں ترے پرتوِ وصال میں ہوں

۵۷۔ نئے انساں کے عجب تیور ہیں

۵۸۔ قلم دل میں ڈبویا جا رہا ہے

۵۹۔ اگر فرشتہ مرے غم سے آشنا ہو جائے

۶۰۔ صرف اِک عزمِ سفر زادِ سفر اپنا تھا

۶۱۔ طوفاں ہے اگر گھر کے درپے، یوں بیٹھ نہ جاؤ، کچھ تو کرو

۶۲۔ اپنے خوابوں کے کئی ارض و سما لے جائے گا

۶۳۔ طیور سے نظر آتے ہیں جو درختوں پر

۶۴۔ خوش ہُوا ہوں تو مجھے اشک فشاں ہونے دو

۶۵۔ ٹوٹتے جاتے ہیں سب آئنہ خانے میرے

☆

مرے لیے مرے غم بھی خدا کی رحمت ہیں
یہ میری عصمتِ کردار کی ضمانت ہیں

جو دشمنی پہ تُلے ہیں، وہ جانتے ہی نہیں
کہ میرے ظاہر و باطن فقط محبّت ہیں

میری شکست کا آغاز میرے گھر سے ہوُا
یہ اور بات کہ دیوار و در سلامت ہیں

مَیں جب بھی آئینۂ زندگی میں جھانکتا ہوُں
جو آدمی نظر آتے ہیں، نقشِ حیرت ہیں

جو چہرہ سامنے آیا، وہ سامنے ہی رہا
زوالِ عمر کے دن کِتنے خوُبصورت ہیں

جنوری ۱۹۸۷ء

☆

آئنے میں بھی وہ حیرت نہ رہی
جب حقیقت ہی حقیقت نہ رہی

جب سے آنکھوں میں کھٹکنے لگی ریت
میرے صحراؤں میں وسعت نہ رہی

عشق، تہذیب میں زنجیر ہوُا۔
کوئی شدّت، کوئی حدّت نہ رہی

جانے اب تک ہے خدا کیوں تنہا
کوئی خلوت بھی تو خلوت نہ رہی

مُسکراؤں بھی تو کِس برتے پر
اب تو رونے کی بھی فرصت نہ رہی

اب تو تیور ہی بلک اُٹھتے ہیں
آہ و فریاد کی حاجت نہ رہی

خُود سے بیگانہ ہوُا ہوُں جب سے
مُجھ کو تجھ سے بھی محبّت نہ رہی

اِتنا پامال ہوُا ذوق ندیمؔ
زخم کھانے میں بھی لذّت نہ رہی

ستمبر ۱۹۸۶ء

☆

دل میں محبّت درد کے پیڑ اُگاتی رہی
صحرا سے پھُولوں کی خوشبو آتی رہی

حبس جو ٹوٹا، مجھے ہوَا نے سمیٹ لیا
دیر تلک پھر ماں کی طرح لپٹاتی رہی

رات کو جیسے فرشتے چھت پہ اُترتے رہے
بُوندوں میں قدموں کی سی چاپ آتی رہی

جب کوئی پتّہ ٹوٹ کے جانِب خاک چلا
شاخ وداعی رنگ میں ہاتھ ہلاتی رہی

جیسے کوئی در پر دستک دیتا ہو
دل کی دھڑکن شب بھر مُجھ کو جگاتی رہی

تجھ سے بچھڑ جانے کے بعد، اس لمحے تک
کونج سی اک، میرے اندر کُرلاتی رہی

وہ جو ندیمؔ نے صُبحِ ازل سے سیکھا تھا
بس وہی نغمۂ ہجر کی رات سُناتی رہی

☆

شفق غبار بنی، اور کوچ کرنے لگی
جبینِ وقت پہ گردِ سفر اُترنے لگی

خدا گواہ، ستم گر جری نہیں ہوتا
گجر پہ ضرب پڑی اور رات ڈرنے لگی

زمیں نے پہلے تو نورِ سحر میں غسل کیا
پھر آفتاب کے آئینے میں سنورنے لگی

وہ جیسے حبس زدوں کے مزار ڈھونڈتی ہے
قدم قدم پہ نگارِ صَبا ٹھہرنے لگی

غزال ساتھ تھے، لیکن شغال تاک میں تھے
حیات جب کِسی گلزار سے گزرنے لگی

شبِ وصال کا آغاز ہی قیامت تھا
ندیمؔ وقت کی گردش طرارے بھرنے لگی

اگست ۱۹۸۶ء

## نذرِ یگانہ

☆

ایک بار پھر ہم کو حکمِ انتظار آئے
ایک بار پھر دل کو بے سبب قرار آئے

تیرے ہجر میں ہم نے، نفی وقت کی کردی
رات کیو گُزاری ہے زندگی گزُار آئے

اب سکوُں سے جینے کا، اپنے پاس گُریہ ہے
رولیے کہیں چھُپ کر، اور تھکن اُتار آئے

کاروبارِ اُلفت میں نقد تھا ہر اِک سودا
ہم جو خالی ہاتھ آئے، اپنی جاں ہی وار آئے

ابتدائے عالم سے، آدمی کے دامن میں
صرف چار لمحے ہیں، وہ بھی مستعار آئے

ہم بساطِ دُنیا کے کچھ عجب کھلاڑی تھے
کائنات کی خاطر، اپنی ذات وار آئے

صرف ایک سُورج ہی روشنی نہیں دیتا
صدیاں جگمگا اُٹھیں، جب فرازِ دار آئے

فروری ۱۹۸۶ء

☆

طلوعِ صُبح کا الزام میرے سَر آیا
کنوئیں کی تہہَ سے مجھے آسماں نظر آیا

صدا ذرا سی بھی، اس خامشی میں حادثہ تھی
خُود اپنے دل کے دھڑکنے سے مُجھ کو ڈر آیا

مَیں دشت و کوہ میں ہوُں یا خُود اپنے آنگن میں
نِکل کے گھر سے، مَیں در اصل اپنے گھر آیا

یہ ایک اشکِ ندامت مُجھے ڈبو ہی نہ دے
سمندروں سے تو مَیں بے خطر گُزر آیا

اس آدمی کے شعور و غرورِ ذات سے ڈر
اَنا بچا کے جو افلاک سے اُتر آیا

مَیں زیرِ تربیّتِ زندگی رہا برسوں
فقط لحد میں اُتر جانے کا ہُنر آیا

سفر میں سر پہ برستے رہے ببول کے پھوُل
ندیؔم یوُں مرے قبضے میں تاجِ زر آیا

اکتوبر ۱۹۸۵ء

☆

شامِ فراق ایک عجب تجربہ ہوُا
جھونکا چلا تو جیسے ترا سامنا ہوُا

کیا جانے اُس کا کوئی ہدف ہے بھی یا نہیں
انساں ہے ایک تیرؔ ازل سے چلا ہوُا

شبنم چمک اُٹھی کفِ گل پر کچھ اس طرح
جیسے زمیں پر ہو ستارا پڑا ہوُا

پہلے وہ رنگ رنگ تھا، اب گرد گرد ہے
یہ برگِ خشک ہے کہ نگر ہے لُٹا ہوُا

شہراہِ شب پہ راہنماؤں کی بھیڑ تھی
ہر ہاتھ میں چراغ تھا لیکن بُجھا ہوُا

اس دَور میں جنوں کے بھی تیور بدل گئے
مجنوں چھُپا رہا ہے گریباں سِلا ہوُا

جب انتظار حد سے گزرنے لگا ندیمؔ
مَیں نے سُنا سکوت کو بھی بولتا ہوُا

اکتوبر ۱۹۸۵ء

☆

خدا تو خیر خدا ہے، بشر نہیں مِلتا
ثمر کہن سے مِلے جب شجر نہیں مِلتا

کھڑا ہوُں سر پہ رکھے دو جہاں کا رختِ سفر
کوئی بحدِّ نظر ہمسفر نہیں مِلتا

عجب صدی ہے کہ بے چہرہ ہوگئی مخلوق
مُجھے کسی کے بھی شانوں پہ، سر نہیں مِلتا

اسیر رہتے ہیں حالات کی چٹانوں میں
وہ آئنے، جنھیں آئینہ گر نہیں مِلتا

اِسی لیے تو جو کل حال تھا، وہ آج بھی ہے
کِسی دُعا کا ثبوتِ اثر نہیں مِلتا

ندیؔم یوُں صدفِ لفظ کے گہُر ہ لُٹا
یہاں تو کوئی بھی صاحب نظر نہیں مِلتا

جون ۱۹۸۵ء

☆

کہنا چاہوں، مگر اے کاش کبھی کہہ پاؤں
آسمانوں سے اُتر آ کہ تُجھے اپناؤں

چھان ڈالی ہے زمیں، اور فضا ور خلا
مَیں تری کھوج میں نکلوں تو کہاں تک جاؤں

ختم ہوتی نظر آئیں ابدیّت کی حدیں
اس سے آگے مَیں خیالوں کو کہاں پہنچاؤں

تُو نے ہر عدل قیامت پہ اُٹھا رکھا ہے
اے خدا، مَیں ترا معیار کہاں سے لاؤں

دُھن یہ رہتی ہے کہ صحراؤں کی جھولی بھرنے
کوہ سے چھین کے اِک آدھ گھٹا لے آؤں

کب خزاں ان کو ہرا ہونے کی عزّت دے گی
زرد پتّوں میں اگر اپنا لہُو دوڑاؤں

مَیں پھڑکتا ہوُں تو صیّاد کا کیا جاتا ہے
اپنے ہی خوُن سے مَیں اپنا ہی جی بہلاؤں

وہ یہ کہتے ہوُئے، پگھلا ہوُا زر پی جائے

شاید اس طرح کبھی صاحبِ فن کہلاؤں

جنوری ۱۹۸۵ء

☆

بارش کو بُلا رہا ہوُں کب سے
مَیں خاک اُڑا رہا ہوُں کب سے

ہر شاخ ہے برگ و بر سے خالی
اشجار اُگا رہا ہوُں کب سے

دیوار میں رخنہ پڑ گیا تھا
اِک خشت جما رہا ہوُں کب سے

گرداب میں سَر اُٹھا اُٹھا کر
ساحل کو بُلا رہا ہوُں کب سے

اِک سمت کی جُستجو کی دُھن میں
ہر سمت کو جا رہا ہوُں کب سے

اِک پل نہیں رُکتی یاد اس کی
مَیں جس کو بھُلا رہا ہوُں کب سے

چہرے ہی نہیں جو منعکس ہوں
آئینے دکھا رہا ہوں کب سے

جنوری ۱۹۸۵ء

☆

بھلا کیا پڑھ لیا ہے اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں
کہ اس کی بخششوں کے اتنے چرچے ہیں فقیروں میں

کوئی سورج سے سیکھے، عدل کیا ہے، حق رسی کیا ہے
کہ کیساں دُھوپ بٹتی ہے صغیروں میں کبیروں میں

ابھی غیروں کی دُکھ پر بھیگنا بھُولی نہیں آنکھیں
ابھی کچھ روشنی باقی ہے لوگوں کے ضمیروں میں

نہ وہ ہوتا، نہ مَیں اِک شخص کو دل سے لگا رکھتا
مَیں دشمن کو بھی گنتا ہوں محبّت کے سفیروں میں

سبیلیں جس نے اپنے خُون کی، ہر سُو لگائی ہوں
مَیں صرف ایسے غنی کا نام لِکھتا ہوں امیروں میں

بدن آزاد ہیں، اندر مگر زنجیر بجتی ہے
کہ مَیں مختار ہو کر بھی گِنا جاؤں اسیروں میں

اکتوبر ۱۹۸۴ء

☆

کائناتوں کے تماشائی تھے
ہم کبھی لالۂ صحرائی تھے

خول ٹوٹا جو اَنا کا، تو کھُلا
ہم خُود اپنے ہی تمنّائی تھے

عُمر بھر بات اُدھوری ہی رہی
اور ہم مخزنِ گویائی تھے

عشق کرتے تھے جنوں کی حد تک
جو بظاہر ہمہ دانائی تھے

ہم، بہ ایں دامنِ صد چاک ندیمؔ
تاجدارِ شبِ تنہائی تھے

ستمبر ۱۹۸۲ء

☆

آخر کار ہم انجامِ سفر تک پہنچے
تیرے در سے جو چلے، پھر ترے در تک پہنچے

پَو جو پھُوٹی تو ستاروں کی لَویں ٹُوٹ گئیں
صِرف آنسوُ شبِ فرقت کے سحر تک پہنچے

راہ میں قصر بھی، معبد بھی، چمن زار بھی تھے
کن خرابوں سے گُـــــــــــزر کر ترے گھر تک پہنچے

اتنا بے بس بھی نہیں ساحلِ بحرِ حالات
موجِ پایاب مچل جائے تو سر تک پہنچے

ہر بشر کو جو خدا پاس بلا لیتا ہے
وہ خُدا بھی تو کِسی روز بشر تک پہنچے

اِک شجر تک بھی نہیں ہے مرے صحرا میں ندیمؔ
اور ضِد ہے، کہ مرا ہاتھ ثمر تک پہنچے

نومبر ۱۹۸۱ء

☆

مُجھے دُکھ یہ ہے کہ بہار میں بھی طیور بے پروبال ہیں
مرے ہمسفر نہ ملول ہوں، یہ ملال میرے ملال ہیں

مری بے کلی سے خفا نہ ہو، مری جُستجو کا بھَرم نہ کھو
تُجھے اِک جواب و بال ہے، مرے لب پہ لاکھ سوال ہیں

وہ تھی اِک لکیر سی آبجو، یہ ہے چار سُو کی فضائے ہُو
وہ گھڑی تھی تیرے وصال کی، یہ فراق کے مہ و سال ہیں

یہ عجیب حُسنِ قیاس ہے، کہ جو دُور ہے، وہی پاس ہے
یہ تصوّرات کے واہمے، مرے دشتِ غم کے غزال ہیں

یہ جو عرصہ گاہِ خیال ہے، ترا فن ہے، تیرا جمال ہے
مری شاعری ہو کہ نثر ہو، یہ سبھی ترے خدوخال ہیں

یہ عجب طرح کا تضاد ہے، یہ دل و نظر کا فساد ہے
مرے تجربے ہیں کمال پر، مرے درد رُو بہ زوال ہیں

نومبر ۱۹۸۱ء

☆

یُوں تو ہر دَور میں ڈھالے گئے پیکر کِتنے
یار لوگوں نے تراشے ہیں مگر سر کِتنے

کہیں دیں ہے، کہیں دُنیا، کہیں ایماں، کہیں کُفر
ایک انسان کے سینے میں ہیں خنجر کِتنے

یہ مرا عجز نہیں، وقت کی سفّاکی ہے
دب گئے ہیں مرے اندر مرے جوہر کِتنے

میرے دامانِ دریدہ پہ نہ جاؤ لوگو!
صدفِ دِل میں لیے بیٹھا ہوُں گوہر کِتنے

ایک جھونکا ہی اُڑا لے گیا، تنِکوں کی طرح
اُن درختوں کو، جو لگتے تھے تناور کِتنے

ایک آئینے میں بس ایک ہی چہرہ ہے ندیمؔ
دل ہی جب ایک ہے، ہوں گے مرے دلبر کِتنے

جولائی ۱۹۸۱ء

☆

تیری گفتار میں تو پیار کے تیور کم تھے
کبھی جھانکا تری آنکھوں میں تو ہم ہی ہم تھے

لمس کے دم سے بصارت بھی، بصیرت بھی ملی
چھو کے دیکھا تو جو پتّھر تھے، نِرے ریشم تھے

تیری یادیں کبھی ہنستی تھیں، کبھی روتی تھیں
میرے گھر کے یہی ہیرے تھے، یہی نیلم تھے

برف گرماتی رہی، دُھوپ اماں دیتی رہی

دل کی نگری میں جو موسم تھے، ترے موسم تھے

میری پونجی مرے اپنے ہی لہُو کی تھی کشید
زندگی بھر کی کمائی مرے اپنے غم تھے

آنسوؤں نے عجب انداز میں سیراب کیا
کہیں بھیگے ہوئے دامن، کہیں باطن نم تھے

جن کے دامن کی ہَوا میرے چراغوں پہ چلی
وہ کوئی اور کہاں تھے، وہ مرے ہمدم تھے

مَیں نے پایا تھا بس اتنا ہی حقیقت کا سراغ
دُور تک پھَیلتے خاکے تھے، مگر مبہم تھے

مَیں نے گرنے نہ دیا، مر کے بھی، معیارِ وقار
ڈوبتے وقت مرے ہاتھ، مرے پرچم تھے

مَیں سرِ عرش بھی پہنچا تو سرِ فرش رہا
کائناتوں کے سب امکاں مرے اندر ضم تھے

عُمر بھر خاک میں جو اشک ہوئے جذب ندیمؔ
برگِ گُل پر کبھی ٹپکے تو وہی شبنم تھے

جولائی ۱۹۸۱ء

☆

خزاں نصیب ہیں، رشتہ مگر بہار سے بھی
مُجھے تو گُل کی توقّع ہے نوکِ خار سے بھی

مُبصر ہوُں مَیں، کہ گِنا جاؤں باوقروں میں
انھیں یہ ضِد کہ مَیں خارج ہوں شمار سے بھی

جہاں بھی جاؤں، اسیرِ حیات رہتا ہوُں
یہ مسئلہ تو نہ حل ہو سکا فرار سے بھی

سحر کی کِتنی دُعا مَیں خُدا سے مانگی ہیں
اب التماس کروں گا جمالِ یار سے بھی

عجیب حشرِ محبّت کا سامنا ہے، کہ وہ
خفا خفا ہے، مگر دیکھتا ہے پیار سے بھی

مَیں مر بھی جاؤں تو تخلیق سے نہ باز آؤں
بنیں گے نت نئے خاکے مرے غبار سے بھی

ندیمؔ وقت کا مرہم نہ میرے کام آیا
کہ زخمِ دل نہ بھرا طوُلِ انتظار سے بھی

مئی ۱۹۸۱ء

☆

اِک محبت کے عوض، ارض و سما دے دوُں گا
تُجھ سے کافر کو تو مَیں اپنا خدا دے دُوں گا

جستجو بھی مرا فن ہے، مرے بچھڑے ہوُئے دوست!
جو بھی در بند ملا، اُس پہ صدا دے دُوں گا

ایک پل بھی ترے پہلوُ میں جو مِل جائے، تو مَیں
اپنے اشکوں سے اسے آبِ بقا دے دُوں گا

توُ کرم کر نہیں سکتا تو ستم توڑ کے دیکھ
مَیں ترے ظلم کو بھی حُسنِ ادا دے دُوں گا

رُخ بدل دُوں گا صبا کا، ترے کوچے کی طرف
اور طوُفان کو اپنا ہی پتہ دے دُوں گا

جب بھی آئیں مرے ہاتھوں میں رُتوں کی باگیں
برف کو دُھوپ، تو صحرا کو گھٹا دے دُوں گا

مئی ۱۹۸۱ء

☆

کِسی لاعلاج رجائی نے یہ خبر چمن میں اُڑائی ہے
کوئی پتّا جب نہ ہو شاخ پر تو سمجھ لو، فصلِ گُل آئی ہے

کوئی اشتراک ضرور ہے، وہ ہو رنگ کا کہ امنگ کا
مرا دل بھی تو گُلِ سرُخ ہے، ترا ہاتھ بھی تو حنائی ہے

وہ کشش کچھ اور ہی چیز ہے جسے حُسن کہتے ہیں اہلِ دل
نہ جمالِ عارض وچشم و لب، نہ کمالِ چست قبائی ہے

سفرِ حیات کے موڑ پر، مُجھے تُو مِلا کہ خُدا مِلا
یہی میرا کعبۂ جُستجو، یہی میری حدّ رسائی ہے

مَیں جُھکوں تو چرخ جُھکا رہے، مَیں رُکوں تو وقت رُکا رہے
مَیں تری وفا کا جب اہل ہوُں، مرے بس میں ساری خُدائی ہے

مَیں ندیؔم قریۂ سیم وزر سے بھی سرکشیدہ گــــــــــــزُر گیا
جو مری اَنا کا غرُور ہے، مری عُمر بھر کی کمائی ہے

اپریل ۱۹۸۱ء

☆

کام ہی کیا ہے مُسافر کو، گزُرنے کا سوا
سبھی آرام میسّر ہیں، ٹھہرنے کے سوا

لہر اُٹھتی ہے نہ دریا میں بھنور پڑتے ہیں
کوئی چارہ نہ رہا پار اُترنے کا سوا

کاش واعظ نے محبّت بھی سکھائی ہوتی
اور کیا کیجیے اللہ سے ڈرنے کا سوا

حُسن کا فرض ہُوا کرتی ہے آرائشِ حُسن
صُبح کیا کرتی ہے ہر روز سنورنے کا سوا

عمر گزُری ہے اُس انساں کے تجسّس میں ندیؔم
اور بھی کام جو کر لیتا ہو، مرنے کا سوا

اپریل ۱۹۸۱ء

www.HallaGulla.com
Virtual Home for Real People

☆

عرش سے سچ کی ہدایت بارہا مِلتی رہی
ہم جو سچ بولے تو کیوں اس کی سزا مِلتی رہی

رزق کی خاطر زمیں کھودی مگر پتّھر ملے
اور اُدھر پتّھر میں کیڑے کو غذا مِلتی رہی

ہم تو اس کو بھی مشیّت کی سخاوت ہی کہیں
زندگی بھر سانس لینے کو ہَوا مِلتی رہی

ایک پَل بھی زندہ رہنا اِک قیامت تھا ندیمؔ
اور طُول عُمر کی ہم کو دُعا مِلتی رہی

مارچ ۱۹۸۱ء

☆

بھرم غزال کا جس طرح رم کے ساتھ رہا
مرا ضمیر بھی میرے قلم کے ساتھ رہا

جُدائیوں کے سفر سر خوشی میں گزرے ہیں
کہ اس کا عکس مری چشمِ نم کے ساتھ رہا

اِک آفتاب مرے سر سے ڈھل سکا نہ کبھی
کہ میرا سایہ مرے ہر قدم کے ساتھ رہا

نہ بھُول پائے وطن کو، جلاوطن جیسے
ہر آدمی کا تعلّق ارم کے ساتھ رہا

دُعا کو ہاتھ اُٹھانے سے خوف آتا ہے
کہ جبرِ برق بھی ابرِ کرم کے ساتھ رہا

گواہ ہے مرا اسلوبِ جاں کنی، کہ ندیمؔ
مرا غرورِ پُنر میرے دم کے ساتھ رہا

مارچ ۱۹۸۱ء

☆

انساں ابھی شہپارۂ ازژنگ نہیں ہے
چہرے پہ سبھی کچھ ہے، مگر رنگ نہیں ہے

جنّت کے سفر میں جو نہ حائل ہوں تو بہتر
فطرت کے عناصر سے مری جنگ نہیں ہے

احساسِ جمال اس کو کبھی ہو نہیں سکتا
شیشے کے مقدّر میں اگر سنگ نہیں ہے

انجام، محبّت کی مسافت کا نہ ڈھونڈو
اتنا بھی تو صحرائے زمیں تنگ نہیں ہے

اِک دَر ہے اگر بند تو بستی میں ہیں سَو دَر
اے دستِ سخا، پائے گدا لنگ نہیں ہے

مارچ ۱۹۸۱ء

☆

دستگیری کر، اے زبانِ جمال
آج مطلوب ہے بیانِ جمال

اور کسِ کا ہے یہ طلسمِ خرام
نقشِ پا سے ملا نشانِ جمال

قریہ قریہ بھٹکتا پھرتا ہوں
تیرا پیکر ہے اِک جہانِ جمال

ڈھونڈتی ہیں کسے تری آنکھیں
اُڑتے پھرتے ہیں طائرانِ جمال

تیرا اقبالِ حُسن اور بڑھے
اِک تبسّم سے کیا زیانِ جمال

اب تو ہر سانس میں ہے گونج تری
اب تو شب پر بھی ہے گمانِ جمال

گُل سے جب برگِ گُل بچھڑ کے گرے
ٹوٹ پڑتا ہے آسمانِ جمال

خشک لب میرے، چھلنی پاؤں مرے
اور لقب ہے، مزا جدانِ جمال

چاند ہے قیسِ دشتِ ہفت افلاک
اور زمیں ناقۂ روانِ جمال

بخش دے گا مجھے خدائے جمیل
مَیں کہ ہوں ایک مدح خوانِ جمال

شعر کہنا شعاعیں چُننا ہے،
شاعری، نورِ جاودانِ جمال

مارچ ۱۹۸۱ء

☆

زندگی غیر کی سوغات نہ ہو
رزق آلودۂ خیرات نہ ہو

کائناتوں کے تناظر میں، زمیں
کہیں منجملۂ ذرّات نہ ہو

جبکہ سب کچھ ہے مرے ہونے سے
کیوں مری ذات کا اثبات نہ ہو

روزِ روشن سے جو آنچ آتی ہے
یہ کہیں جلتی ہوئی رات نہ ہو

میں عناصر سے دُعا مانگتا ہوں
چھت ٹپکتی ہو تو برسات نہ ہو

آئنہ دیکھ کے مُجھ کو، بولا
کوئی داماندۂ حالات نہ ہو

اب تو یہ غایتِ فن ٹھہری ہے
شعر شرمندۂ جذبات نہ ہو

لب ترستے ہیں تبسّم کو ندیمؔ
ضبطِ غم کی یہ مکافات نہ ہو

فروری ۱۹۸۱ء

☆

لچک سی جیسے لپکتی ہوئی صَدا میں پڑے
ترا خرام جو دیکھا تو بَل ہوَا میں پڑے

جو دن تھا، حشر کا دن تھا۔ جو شب تھی، حشر کی شب
عجیب طرح کے جنگل رہِ وفا میں پڑے

خدا کو گونج کا انداز کِتنا پیارا ہے
مری دُعا ہی مرے دامنِ دُعا میں پڑے

جو مشتِ خاک تھی، تپ کر بھی مشتِ خاک رہی
مُجھے زمانہ ہوُا علمِ کیمیا میں پڑے

مَیں ایک بار تو خود اپنے کام آؤں ندیمؔ
مرے مزاج کا سونا مری دوا میں پڑے

فروری ۱۹۸۱ء

☆

کچھ نہ تھا زیست کے صحرائے بلا سے آگے

پھر وہی دشت ملا، حدِّ فنا سے آگے

نارسائی، ہی دُعاؤں کا مقدّر ہے اگر
مَیں نِکلنے کو ہوُں اب اپنی صدا سے آگے

اس کے دامن میں فقط اس کی اَنا ہوتی ہے
ہاتھ رہتا ہو سدا جس کا، عطا سے آگے

یوُں خلاؤں کے تجسّس میں ہوں غلطاں جیسے
اِک زمیں اور بھی ہو ماہ و سہا سے آگے

مُجھ کو امکان کے روزن سے نظر آتے ہیں
نِت نئے ارض و سما۔ ارض وسما سے آگے

یہ کسی بھُولی ہوُئی یاد کی ہے رمز ندیمؔ
اِک ہیولیٰ سا ہے کیا، موجِ صبا سے آگے

فروری ۱۹۸۱ء

☆

میری پہچان نمازیں ہیں نہ تکبیریں ہیں
آج کل میرا تعارف مری تقصیریں ہیں

آنکھ کھُلتے ہی اُجڑ جاتے ہیں منظر سارے
خواب لاکھوں ہیں، مگر ایک سی تعبیریں ہیں

پڑھنے والو! کوئی مفہوم تو ہوگا ان کا
صفحۂ ابر پہ کوندوں کی جو تحریریں ہیں

ہم پذیرائی پہ مامُور ہیں، اے خواجۂ شہر!
ہاتھ میں پھُول ہیں اور پاؤں میں زنجیریں ہیں

سب خدوخال خدا کے ہیں مصّور جیسے
یہ جو انسان نظر آتے ہیں، تصویریں ہیں!

فروری ۱۹۸۱ء

☆

دل میں اب درد مچلتا ہی نہیں
اِک دیا تھا، سو وہ جلتا ہی نہیں

زہرِ تنہائی کا تریاق ہے چاند
اور وہ بادل سے نِکلتا ہی نہیں

یوں تو چھتنا رہے نخلِ اُمید
پھُولتا خُوب ہے، پھلتا ہی نہیں

مُجھ کو قسّمِ ازل نے بخشا
وہ مقدّر، جو بدلتا ہی نہیں

جی کے بھی۔مر کے بھی دیکھا مَیں نے
دل کِسی طَور بہلتا ہی نہیں

شام ہر دن کو نِگل جاتی ہے
اِک یہ لمحہ ہے جو ٹلتا ہی نہیں

اِس پہ شاہد ہے مری عُمر ندیمؔ
وقت اُڑتا بھی ہے، چلتا ہی نہیں

جنوری ۱۹۸۱ء

☆

یہ غم نہیں، کوئی پتّھر اِدھر بھی آئے گا
کہ اس کے بعد مرا شیشہ گر بھی آئے گا

مَیں اس یقیں سے، ٹھِٹھرتا ہوُں شب کے سائے تلے
اسی شجر پہ سحر کا ثمر بھی آئے گا

مَیں عُمر بھر درِ دل وارکھوں گا اس کے لیے

کہ وہ خُدا ہے تو پھر اپنے گھر بھی آئے گا

یہ سوچ کر مَیں اُلجھتا ہوُں آسمانوں سے
کہ ٹوُٹ کر کوئی تارا اِدھر بھی آئے گا

ندیمؔ درد سے دل ہی نہیں ہرے ہوں گے
ہُنر وروں کو غزل کا ہُنر بھی آئے گا

دسمبر ۱۹۸۰ء

☆

کِتنے طلسم عشق کی نادانیوں میں تھے
گُل سے لبوں میں، چاند سے پیشانیوں میں تھے

ڈرتے تھے چاند سے بھی، ہراساں تھے گُل سے بھی
جو لوگ اپنی ذات کے زندانیوں میں تھے

ساحل پہ۔شب۔زمیں کا فلک سے وصال تھا
اُترے ہوُئے نجوم، رواں پانیوں میں تھے

ہر فکر کا مآل، جوازِ گناہ تھا
جتنے ثواب تھے، مری حیرانیوں میں تھے

دِیمک تنے کو چاٹتی جاتی تھی، اور ہم
کِتنے مگن شجر کی نگہبانیوں میں تھے

چہرے تو اہلِ شہر کے تھے پُرسکوں مگر
دُوبے ہوئے ضمیر پشیمانیوں میں تھے

یوسف کا اِک لقب مہِ کنعاں تو تھا، مگر
یوسف کے بھائی بھی انہی کنعانیوں میں تھے

پھُولوں میں پتّھروں کو لپیٹے ہوئے ندیمؔ
مصرُوف یار لوگ گُل افشانیوں میں تھے

اکتوبر ۱۹۸۰ء

☆

اِن زمینوں میں شجر کاریِ نو ہے درکار
سبز ہوتے نہیں اُکھڑے ہوئے پودے زنہار

فصلِ گُل آئے تو بٹ جائے توجّہ شاید
مُجھ سے ہوتا نہیں سُوکھے ہوئے پتّوں کا شمار

کوئی منزل، نہ کوئی سمت معیّن اپنی
ہم ہیں بے ربط کہانی کے اُدھورے کردار

اب زبردست کو یلغار کی حاجت ہی نہیں
اب تو نیلام پہ چڑھ جاتا ہے قوموں کا وقار

رُخ پہ برنائی بھی ہو، چال میں رعنائی بھی ہو
صرف مخلوقِ خُدا سے نہیں سجتے بازار

اب تو مہرِ لب اظہار، خُدارا، توڑو
مُجھ کو اس وقت فقط اذنِ فغاں ہے درکار

اب تو واجب ہوُا خورشیدِ قیامت کا طلوع
چار جانب ہے گھٹا ٹوپ اندھیرے کا حصار

قدغنوں پر سے اُچھل جاتا ہے سیلِ تاریخ
اور فلک تک تو کبھی اُٹھ نہیں سکتی دیوار

تیر زن آج تو وہ شخص بھی کہلائے ندیمؔ
شیر کی جگہ جو کرتا رہے چڑیوں کا شکار

اکتوبر ۱۹۸۰ء

☆

بے شمار انسان ہیں، سب کا سراپا ایک ہے
سب کے خال و خد جُدا ہیں، اور چہرہ ایک ہے

بے حساب اسلوب ہیں اظہارِ مطلب کے، مگر
آنکھ سے گرتے ہوئے اشکوں کا لہجہ ایک ہے

آخری سچّائی کی منزل ہے سب کے سامنے
سب کی راہیں مختلف ہیں، سب کا جذبہ ایک ہے

مَیں نے ماضی اور مستقبل کی صدیاں چھان لیں
مَیں نے دیکھا ۔۔ وقت کے کیسے میں لمحہ ایک ہے

عدل کر، اولادِ آدم کے مقدّر! عدل کر
تشنہ لب لاکھوں کروڑوں، اور دریا ایک ہے

وسعتِ عالم میں مانندِ لحد اُبھرا ہوُا
جستجو کے بحرِ ظلمت میں جزیرہ ایک ہے

سُب کے سب فانی ہیں، باقی ہے فقط ذاتِ خدا،
قاتل و مقتول کی قبروں پہ کتبہ ایک ہے

پیار سے قائم ہے تخلیقِ دوعالم کا بھرم

اس شجر کی اَن گنت شاخیں ہیں، پتّا ایک ہے

جتنے چہرے ہیں وہ اِک چہرے کا عکس و نقش ہیں
یوں تو رشتے سیکڑوں ہیں، اصل رشتہ ایک ہے

کیا بتاؤں، کون سی تخصیص مُجھ کو بھا گئی
یوں تو اپنے ہیں سب انساں، میرا اپنا ایک ہے

کِتنی وحدت ہے صداؤں کے تنوع میں ندیؔم
ساز سب کے اپنے اپنے، سب کا نغمہ ایک ہے

ستمبر ۱۹۸۰ء

☆

دکھ سب کو خود اپنی ذات کا ہے
انجام یہی حیات کا ہے

ہر شخص کے کہہ رہے ہیں تیور
مرکز وہی کائنات کا ہے

مجبُور نہیں خُدا، مگر کیوں
جو کچھ ہے، ہدف ممات کا ہے

اِک سانس پہ دسترس نہیں ہے
اور خواب وہی ثبات کا ہے

دُنیا کو بنالیا ہے دشمن
جھگڑا فقط التفات کا ہے

محکومِ خیر و شر کو تج دے
یہ راستہ ہی نجات کا ہے

مشرق سے نِکل رہا ہے سُورج
یہ سارا کمال رات کا ہے

قدرت کی بھی اِک جہت نہیں ہے
یہ کھیل ہی شش جہات کا ہے

تِنکا ہے ندیمؔ ۔۔ زندگانی
اور سیل تغیّرات کا ہے

اگست ۱۹۸۰ء

www.HallaGulla.com
Virtual Home for Real People

☆

کچھ گھبرایا گھبرایا سا لگتا ہوں
ابھی ابھی زندانِ ذات سے نِکلا ہوں

روزِ قیامت ہے میرا ہر روزِ حیات
حشر ہوں اور خود اپنے اندر برپا ہوں

زندگی کرنے کا فن خود سیکھا ہی نہیں
اور سارے الزام خدا پر دھرتا ہوں

مَیں نے پیاس بُجھانی چاہی پیاسوں کی
اب صحرا میں غائب ہوتا دریا ہوں

ایک دیا ہوں، جس نے جل کے سحر کردی
اب سُورج کے حوالے، اب مَیں چلتا ہوں

تیرے ساتھ چلوں، گر تیری اجازت ہو
قافلۂ گُل! میں جو خزاں کا پتّا ہوں

دھرتی پر کچھ دیر تو مُجھ کو رُکنے دو!
کڑے سفر کے بعد یہاں تک پہنچا ہوں

مَیں جو گراں ہوں زر کے ہزار انباروں سے

پھُول کی پتّی سامنے ہو تو سستا ہوُں

میرا کمالِ فن ہے امکانات کی سیر
ریت پہ بیٹھا پھُول بناتا رہتا ہوُں

کوئی شجر ہی نہیں ہے جس سے کلام کروں
حبس کے ویرانوں میں بھٹکتا جھونکا ہوُں

میں ۔۔ میرے نقّاد ۔۔ بہت ہی بُرا سہی
اتنا بُرا نہیں ہوُں جتنا اچھا ہوُں

رات کو روشن رکھنا میرا کام ندیمؔ
شام کا پہلا، صُبح کا آخری تارا ہوُں

اپنے لہوُ سے آپ چراغاں کرتا ہوُں
مُجھ کو بھی دیکھو، مَیں بھی تو ایک تماشا ہوُں

میرے عدوئے، تیرہ ضمیر کو کیا معلوم
نُورِ سحر ہوُں، اور اُفق پر مِلتا ہوُں

دشتِ خیال کا ایک بگولا ہوُں، لیکن
عرش کو چھُوتا ہوُں جب فرش سے اُٹھتا ہوُں

میری حیات، تلاشِ جنّتِ گم گشتہ
اوّل دن سے اپنے وطن سے بچھڑا ہوُں

باندھ رکھا ہے مَیں نے ازل سے رختِ سفر
کھول کے شہپرِ فکر، ابد تک اُڑتا ہوُں

ایک آواز مسلسل پیچھا کرتی ہے
۔۔ انسانو! مَیں باغِ بہشت میں تنہا ہوُں۔

مَیں انسان ہوُں، میرا غرُوب قیامت ہے
مَیں سوُرج ہوُں اور بظاہر ڈُوبا ہوُں

گُزرے دنوں کی گوُنج بھی میرے کان میں ہے
آنے والے دَور کی چاپ بھی سُنتا ہوُں

پاس رہے جس کو آدابِ عداوت کا
مَیں دیوانہ اُس دشمن پر مرتا ہوُں

شاید مستقبل کا مؤرّخ ہی سُن لے
پتّھر کی دیوار پہ دستک دیتا ہوُں

شعر کہے تو کبھی کبھی محسوس ہوُا
جیسے اَبر ہوُں، اور خلا میں برسا ہوُں

اپنی فنا سے مُجھ کو بلا کی ضد ہے ندیمؔ
سبزہ بن کر اپنی لحد سے نِکلا ہوُں

اگست ۱۹۸۰ء

☆

پیماں جو بندھ رہے ہیں، کوئی سُن رہا نہ ہو
یعنی کہیں قریب ہمارا خدا نہ ہو

اے پاسِ وضع کے نفسِ سرد! دیکھنا
میرا چراگِ ضبطِ فغاں بُجھ گیا نہ ہو

مَیں سُن رہا ہوُں کب سے ترے دل کی دھڑکنیں
لیکن یہ رَخشِ وقت کی آوازِ پا نہ ہو

شبنم کے انتظار میں مُرجھا کے جو گِرا
وہ برگِ گُل کہیں مرا دستِ دُعا نہ ہو

دکھ ہے تو صرف یہ، کہ وہ دُکھ دے کے خوش ہوُا
ورنہ کسی بھی دُکھ سے مُجھے دُکھ ذرا نہ ہو

وہ غم ہی کیا، جو غم کا مداوا نہ کر سکے
وہ دل ہی کیا، جو راکھ تو ہو، کیمیا نہ ہو

کوئی سبب تو ہو مرے باطن کے نوُر کا
آنسو ہی دل میں، بن کے ستارہ، گرا نہ ہو

آئیندہ کا سفر ہے، مگر ہر قدم یہ فکر

ماضی کا نقشِ پا ہی مرے زیرِ پا نہ ہو

آواز کفر ہے، تو کچھ ایسا ہو اہتمام
ٹُوٹے گر آسماں بھی، تو کوئی صدا نہ ہو

انعام پا رہا ہوُں مَیں خُود اپنے قتل کا
یارب، اس امتحاں میں کوئی مبتلا نہ ہو

تہذیب کا یہ کتنا مہذّب اصُول ہے
پردے میں چاہے کچھ ہو، مگر برملا نہ ہو

اِک عُمر سے ہے مُجھ کو اس انسان کی تلاش
اچھا جو مُجھ سے بڑھ کے ہو، مُجھ سے بُرا نہ ہو

گر وُہ مری دُعا ہے، تو پُوری بھی ہو ندیمؔ
گر وہُ مرا خُدا ہے، تو پھر نارسا نہ ہو

اگست ۱۹۸۰ء

☆

مداوا حبس کا، ہونے لگا آہستہ آہستہ
چلی آتی ہے وہ موجِ صبا آہستہ آہستہ

ذرا وقفے سے نِکلے گا، مگر نکلے گا چاند آخر
کہ سُورج بھی تو مغرب میں چھُپا آہستہ آہستہ

کوئی سُنتا تو اِک کہرام برپا تھا ہواؤں میں
شجر سے ایک پتّا جب گرا آہستہ آہستہ

تعجّب میرے جل بُجھنے پہ کیوں ہے میرے پیاروں کو
مَیں اپنی آنچ میں تپتا رہا آہستہ آہستہ

ابھی سے حرفِ رخصت کیوں جب آدھی رات باقی ہے
گُل و شبنم تو ہوتے ہیں جُدا آہستہ آہستہ

مُجھے منظور، گر ترکِ تعلّق ہے رضا تیری
مگر ٹُوٹے گا رشتہ درد کا آہستہ آہستہ

غرورِ مدّعا، شرمندۂ اظہار کیوں ہوتا
مَیں اشکوں ہی میں سب کچھ کہہ گیا آہستہ آہستہ

پھر اس کے بعد شب ہے، جس کی حد صبحِ ابد تک ہے
مغنّی! شام کا نغمہ سنا آہستہ آہستہ

شبِ فرقت میں جب نجمِ سحر، بھی ڈوُب جاتا ہے
اُترتا ہے مرے دل میں خدا آہستہ آہستہ

مَیں شہرِ دل سے نِکلا ہوُں سب آوازوں کو دفنا کر

ندیمؔ اب کون دیتا ہے صدا آہستہ آہستہ

اگست ۱۹۸۰ء

☆

جانے کس سمت سے آیا ہوُں، کدھر جاتا ہوُں
کوئی پوُچھے تو یہ کہتا ہوُں کہ گھر جاتا ہوُں

مَیں جو ظلمات سے درّانہ گُزر جاتا ہوُں
برگِ گُل خاک پہ گرتا ہے تو مر جاتا ہوُں

مَیں فرشتوں کو بھی خاطر میں نہ لاؤں، لیکن
اپنا جب سامنا کرتا ہوُں تو ڈر جاتا ہوُں

ساری دُنیا سے الگ ہے مرا ستانا بھی
خار چھُبتا ہے تو پَل بھر کو ٹھہر جاتا ہوُں

مُجھ پہ تہمت ہے کہ مَیں کچھ بھی نہیں کر پاتا
چیخ کر، دشت کو سنسان تو کر جاتا ہوُں

مَیں سمندر ہوُں، جو کرتا نہیں توہینِ وفا
چاند کے ساتھ ہی، ساحل سے اُتر جاتا ہوُں

پھوُل سا میرا مقدّر ہے، کہ مَیں بھی تو ندیؔم
صُبح کِھلتا ہوُں مگر شام بِکھر جاتا ہوُں

ستمبر ۱۹۸۰ء

www.HallaGulla.com

☆

بگڑ کے مُجھ سے، وہ میرے لیے اُداس بھی ہے
وہ زود رنج تو ہے، پر وفا شناس بھی ہے

تقاضے جسم کے اپنے ہیں، دل کا اپنا مزاج
وہ مُجھ سے دُور ہے، اور میرے آس پاس بھی ہے

نہ جانے کون سے چشمے ہیں ماورائے بدن
کہ پا چکا ہوں جسے، مُجھ کو اس کی پیاس بھی ہے

وہ ایک پیکرِ محسوس، پھر بھی نا محسوس
مرا یقین بھی ہے اور مرا قیاس بھی ہے

جبیں بہت ہیں مگر میرا انتخاب ہے وہ
کہ اس کے حُسن پہ باطن کا انعکاس بھی ہے

ندیؔم اُسی کا کرم ہے، کہ اس کے در سے ملا
وہ ایک دردِ مسلسل جو مُجھ کو راس بھی ہے

ستمبر ۱۹۸۰ء

☆

مرے سوال کا، یارب! کوئی جواب ملے
زمیں پہ کیوں مُجھے اتنے فلک مآب ملے

یہ روزِ حشر ہے، لیکن مرے حساب سے قبل
مجھے خدا کی عنایات کا حساب ملے

وفورِ تشنہ لبی تھا کہ نقصِ دیدہ وری
مجھے تو جتنے سمندر ملے، سراب ملے

عظیم شہر حقیقت میں کِتنا چھوٹا تھا
تمام قصر نشیں خانماں خراب ملے

کوئی بتا نہ سکا مجھے کو مدّعائے حیات
جو گُل کِھلا تو کئی راز بے حجاب ملے

نہ مَیں طِلسم کا ماہر، نہ مجتہد، نہ رسُول
مگر مجھے سفرِ شب میں آفتاب ملے

اگر نہیں ہے خدا کا کوئی شریک ندیمؔ

تو مُجھ غریب کو بھی ہجر کا ثواب ملے

ستمبر ۱۹۸۰ء

☆

نہ جانے ترجماں ہیں کس قیامت کے اشاروں کی
دلِ افلاک میں اُتری ہوئی نوکیں ستاروں کی

اَنا کی آندھیوں میں ٹُوٹ جاتے ہیں شجر کِتنے
نہیں ہوتی خبر دریاؤں کو، کٹتے کناروں کی

میں آنکھیں کھول کر کچھ دیکھنا چاہوں تو بے بس ہوُں
کہ تارِیخ جہاں گردِ سفر ہے شہ سواروں کی

یہیں سے کاروانِ رنگ و بُو اِک روز گزرا تھا
چمن کے زرد پتّے یادگاریں ہیں بہاروں کی

مَیں راہِ زندگی میں جب بھی ٹھوکر کھا کے گرتا ہوُں
بدل لیتی ہے تیور دوست داری میرے یاروں کی

محبّت میں تو غم بھی نفع ہے، دُکھ بھی کمائی ہے
محبّت میں کبھی گِنتی نہیں ہوتی خساروں کی

نخلستان ہے تنہائیوں کے رہگزاروں کا
مرے اندر جو بستی بس رہی ہے میرے پیاروں کی

گریزاں ہے ابھی تک آدمی نورِ حقیقت سے
ابھی تک رسم ہے اربابِ فن میں استعاروں کی

اگر سچ بولنا چاہو تو شعروں میں بھی سچ بولو!
کہ اب اس عہد کو حاجت نہیں جادو نگاروں کی

زمیں پر حضرتِ انساں کی جوہر آفرینی سے
ندیمؔ اب آسماں کو بھی ضرورت ہے بہاروں کی

جولائی ۱۹۸۰ء

☆

عِشق میں ضبط کا یہ بھی کوئی پہلو ہوگا
جو مری آنکھ سے ٹپکا، ترا آنسو ہوگا

ایک پَل کو تری یاد آئے تو مَیں سوچتا ہوُں
خواب کے دشت میں بھٹکا ہوُا آہُو ہوگا

تجھ کو محسوس کروں، مَس نہ مگر کر پاؤں
کیا خبر تھی کہ تو اِک پیکرِ خوشبو ہوگا

اب سمیٹا ہے تو پھر مُجھ کو ادھُورا نہ سمیٹ
زیرِ سر سنگ نہ ہوگا، مرا بازُو ہوگا

مُجھ کو معلوُم نہ تھی ہجر کی یہ رمز، کہ تُو
جب مرے پاس نہ ہوگا تو بَہر سُو ہوگا

اِس توقّع پہ مَیں اب حشر کے دن گِنتا ہوُں
حشر میں اور کوئی ہو کہ نہ ہو،۔۔ تُو ہوگا

جولائی ۱۹۸۰ء

☆

زیست آزار ہوُئی جاتی ہے
سانس تلوار ہوُئی جاتی ہے

جسم بیکار ہوُا جاتا ہے
رُوح بیدار ہوُئی جاتی ہے

کان سے دل میں اُتری نہیں بات
اور گفتار ہوُئی جاتی ہے

دُھل کے نِکھری ہے حقیقت جب سے
کچھ پُر اسرار ہوُئی جاتی ہے

اب تو ہر زخم کی منہ بند کلی
لبِ اظہار ہوُئی جاتی ہے

پھُول ہی پھُول ہیں ہر سمت ندیمؔ
راہ دشوار ہوُئی جاتی ہے

جولائی ۱۹۸۰ء

☆

پیار کے دائرے کو تنگ کروں
یعنی اپنی اَنا سے جنگ کروں

جب مرا خون میرے کام نہ آئے
ریگِ صحرا کو رنگ رنگ کروں

آندھیوں میں چراغ لے کے چلوں

اور عناصر کو دنگ دنگ کروں

حمدِ ربِ جمال ہے یہ بھی
ذکرِ حسنِ درونِ سنگ کروں

عشق کرتا ہے زہر خند ندیمؔ
جب بھی احساسِ نام و ننگ کروں

جولائی ۱۹۸۰ء

☆

زہر کے بعد جو شرمندۂ تریاق ہوئے
آج وہ لوگ بھی منجملۂ عشاق ہوئے

زندگی بھر کوئی ہمراز نہ پایا ہوگا
درد کو سب سے چھپانے میں جو مشاق ہوئے

جو فرشتے تھے، وہ تاحشر فرشتے ہی رہے
اور جو خاک کے پیکر تھے، وہ خلّاق ہوئے

غوطہ زن حرف کبھی شعر نہ بننے پائے
لفظ جو سطح پہ تھے، زینتِ اوراق ہوئے

دُور و نزدیک کا محور تھی مری ذات ندیمؔ
دائرے میری نظر کے، مرے آفاق ہوئے

جولائی ۱۹۸۰ء

☆

ہر سمتِ چمن ماتم ہوُا ہے
شجر سے اِک پتّا کم ہوُا ہے

اجل، تاریخِ انساں کا خلاصہ
یہی اِک واقعہ پیہم ہوُا ہے

ابھی گزری تھی دل سے یاد اُس کی
کہ صحرا میں ہرن کا رم ہوُا ہے

نئی امید کیوں دل کو دلاؤں
بڑی مشکل سے مستحکم ہوُا ہے

ابھی ''کُن'' کہتے کہتے رہ گیا ہوُں
محبّت میں عجب عالم ہوُا ہے

ندیمؔ احباب نے جتنا کُریدا
مرا غم اور بھی محکم ہوُا ہے

جولائی ۱۹۸۰ء

☆

کون کہتا ہے کہ تجھ سی کوئی صُورت نہ ملی
ہاں مگر مجھ کو تری یاد سے مُہلت نہ ملی

درد چمکا کہ مری رُوح میں سُورج اُترا
عمر بھر راہِ وفا میں کہیں ظلمت نہ ملی

زندگی آج بھی بھر پور ہے ان کے دم سے
جن کو فرہاد کے انجام سے عبرت نہ ملی

مجھ کو اس شخص کے افلاس پہ رحم آتا ہے
جس کو ہر چیز ملی، صرف محبّت نہ ملی

وہ بھی کیا عِلم ۔۔ کہ جس سے تجھے ۔اے بحرِ علوم!
دل کی وسعت نہ ملی، غم کی دیانت نہ ملی

سرِ بازار کہیں جُرم نہ ہو ہنسنا بھی
سرِ دربار تو رونے کی بھی رخصت نہ ملی

مار ڈالے گا اُسے جُرم کا احساس ندیمؔ
قتل کر کے جسے، مقتول پہ سبقت نہ ملی

جولائی ۱۹۸۰ء

☆

ہونٹوں پہ تبسّم لانے کو ہم کتنے خراب و خوار ہوئے
لیکن جو تبسّم جمع کیے، سب نذرِ اُمیدِ بہار ہوئے

برسوں کی خموشی نے ہم سے بدلہ بھی لیا تو بلا کا لِیا
گُفتار کی آزادی جو ملی، الفاظ ہی بے اظہار ہوئے

جشنِ انسان شماری میں سر گِننے نِکلے اہلِ حَکَم
مژدہ ہو کہ ان کی ضرورت سے ہم بھی زندوں میں شمار ہوئے

اِک چیخ بھی جو سر کر نہ سکے، محفوظ تھی ان کے دہن میں زبان
وہ سب ہی بریدہ زباں ہوں گے، گویا جو سرِ دربار ہوئے

ہر دَور کے فن کاروں نے سدا، جو کام کیا، اُلٹا ہی کیا
مقبول تھا سنگ زنی کا چلن، یہ لوگ مگر گُل بار ہوئے

اِک قصرِ منقّش میں آخر ہم نے بھی ندیمؔ قیام کیا
میدان بنے اس کے آنگن، کہسار اس کی دیوار ہوئے

جولائی ۱۹۸۰ء

☆

عجب جہانِ طلسمات میرے اندر تھا
مَیں مُشتِ خاک سہی، رُوح کا سمندر تھا

اب آئے اور زرِ دل سمیٹ کر لے جائے
جو میرا دوست تھا، جو میرا کیمیا گر تھا

حسیں وہی تو رہے گا جو نارسا بھی رہے
قریب جا کے جو دیکھا، ستارہ پتّھر تھا

نرالا عذر تراشا تھا مسخ چہروں نے
کہ اس دیار کا ہر آئنہ مکدّر تھا

کچھ ایسے ختم ہوئی عمر بھر کی تنہائی
کہ میرے چار طرف دشمنوں کا لشکر تھا

گماں یہ تھا کہ وہ تھک کر شجر پہ اُترا ہے
اُڑا تو پنجۂ شاہین میں کبوتر تھا

ندیمؔ چشمِ فلک سے ٹپک رہے تھے نجوم
شبِ فراق بڑا اشک بار منظر تھا

جون ۱۹۸۰ء

☆

عجیب رنگ ترے حُسن کا، لگاؤ میں تھا
گلاب جیسے کڑی دُھوپ کے الاؤ میں تھا

ہے جس کی یاد مری فردِ جُرم کی سُرخی
اسی کا عکس مرے ایک ایک گھاؤ میں تھا

یہاں وہاں سے کنارے مُجھے بُلاتے رہے
مگر مَیں وقت کا دریا تھا اور بہاؤ میں تھا

عروسِ گُل کو صبا جیسے گدگدا کے چلے
کچھ ایسا پیار کا عالم ترے سبھاؤ میں تھا

مَیں پُر سکوں ہوُں، مگر میرا دل ہی جانتا ہے
جو انتشار محبّت کے رکھ رکھاؤ میں تھا

غزل کے رُوپ میں تہذیب گا رہی تھی ندیمؔ
مرا کمال، مرے فن کے اس رچاؤ میں تھا

اپریل ۱۹۸۰ء

☆

سطح پر آج تو پتّھر بھی اُبھرنا چاہیں
اِک ہم انسان ہیں جو ڈوُب کے مرنا چاہیں

اپنے سر پھوڑ لیں، یا موم کریں پربت کو
لوگ جلدی میں ہیں، کچھ فیصلہ کرنا چاہیں

سرِ گلزار لیے بیٹھے ہی چھلنی تلوے
ہم، جو کلیوں پہ کبھی پاؤں نہ دھرنا چاہیں

مادرِ خاک کی آغوش سے بچھڑے ہوُئے پھُول
سینۂ خاک پہ گر گر کے بکھرنا چاہیں

کتنے فن کار ہیں وہ لوگ جو پیارے ہیں ندیؔم
شعر کی طرح لہو تک میں اُترنا چاہیں

فروری ۱۹۸۰ء

☆

کبھی ہیرے کبھی پکھراج میں ڈھلنے والے
ہم نے پتّھر بھی چُنے رنگ بدلنے والے

اب کے گلزار پہ یوں ٹوٹ پڑا رنگِ بہار
جیسے ہر پھُول سے شعلے ہوں نِکلنے والے

رات آنسو اُمڈ آئے تو عجب منظر تھا
ہم نے دیکھے مہ و انجم بھی پگھلنے والے

نارِ نمرود کی کیا ان کو ضرورت ہوگی
اپنی حدّت ہی میں جل جاتے ہیں جلنے والے

تھک کے ٹیلوں پہ اُتر آئی ہیں پیاسی چڑیاں
جیسے صحراؤں میں چشمے ہوں اُبلنے والے

وقت احکام سے نجیر نہیں ہو سکتا
آنے والے ہیں جو لمحے، نہیں ٹلنے والے

کبھی خورشیدِ قیامت بھی تو نِکلے گا ندیمؔ
دُھوپ سے ڈرتے رہی سائے میں چلنے والے

فروری ۱۹۸۰ء

☆

میری محدود بصارت کا نتیجہ نِکلا
آسماں میرے تصّور سے بھی ہلکا نِکلا

روزِ اوّل سے ہے فطرت کا رقیب آدم زاد
دُھوپ نِکلی تو مرے جسم سے سایا نِکلا

جب بھی اُٹھا کوئی فِتنہ، مُجھے محسوس ہوُا
کہ جو ابلیس کا دعویٰ تھا، وہ سچّا نِکلا

سرِ دریا تھا چراغاں کیا اجل رقص میں تھی
بلبلا جب کوئی ٹوٹا تو شرارا نِکلا

بات جب تھی کہ سرِ شام فروزاں ہوتا
رات جب ختم ہوُئی، صبح کا تارا نِکلا

مدّتوں بعد جو رویا ہوُں، تو یہ سوچتا ہوُں
آج تو سینۂ صحرا سے بھی دریا نِکلا

کچھ نہ تھا۔کچھ بھی نہ تھا، جب مرے آثار کھُدے
ایک دل تھا، سو کئی جگہ سے ٹُوٹا نِکلا

لوگ شہپارۂ یک جائی جسے سمجھے تھے

اپنی خلوت سے جو نکلا تو بکھرتا نِکلا

میرا ایثار مرے زعم میں بے اجر نہ تھا
اور مَیں اپنی عدالت میں بھی جھُوٹا نِکلا

وہی بے انت خلا ہے، وہی بے سمت سفر
میرا گھر میرے لیے عالمِ بالا نِکلا

زندگی ریت کے ذرّات کی گِنتی تھی ندیمؔ
کیا تم ہے! کہ عدم وہی صحرا نِکلا

نومبر ۱۹۷۹ء

☆

اِتنا دشوار نہیں موت کو ٹالے رکھنا
سر جو کٹ جائے تو دستار سنبھالے رکھنا

چوٹ کھانا، مگر اس طرح کہ لَو دے اُٹھے
ظلمتِ غم اسی تارے سے اُجالے رکھنا

اپنے احباب کو سینے سے لگائے پھرنا
ایک خنجر بھی مگر جیب میں ڈالے رکھنا

میری پہچان مرے پیرہنِ زخم سے ہے
اب بھی اعزاز سہی شال دوشالے رکھنا

دشتِ احساس کی حِدّت بھی قیامت ہے ندیمؔ
کچھ ضروری تو نہیں پاؤں میں چھالے رکھنا

اکتوبر ۱۹۷۹ء

☆

اپنے ماحول سے تھے قیس کے رشتے کیا کیا
دشت میں آج بھی اُٹھتے ہیں بگولے کیا کیا

عشق معیارِ وفا کو نہیں کرتا نیلام
ورنہ ادراک نے دکھلائے تھے رستے کیا کیا

جیسے ہم آدم و حوّا کی سزا بھُول گئے
ورغلاتے رہے جنّت کے نظّارے کیا کیا

سائے کا ساتھ بھی جب چھُوٹ گیا ظُلمت میں
یاد آتے رہے مُجھ کو مرے پیارے کیا کیا

یہ الگ بات کہ برسے نہیں، گرجے تو بہت

ورنہ بادل مرے صحراؤں پہ اُمڈے کیا کیا

آگ بھڑکی تو در و بام ہُوئے راکھ کے ڈھیر
اورر دیتے رہے احباب دلاسے کیا کیا

کِسی بدبخت سے جب دل کا دیا بھی نہ جلے
آسمانوں سے اُترتے ہیں اندھیرے کیا کیا

لوگ اشیاء کی طرح بِک گئے اشیاء کے لیے
سرِ بازار تماشے نظر آئے کیا کیا

کہیں قبروں کی نشاں ہیں، کہیں قدموں کے نشاں
کارواں زیست کی شاہراہ سے گُزرے کیا کیا

گونج اُٹھتا دلِ انساں، تو کوئی بات بھی تھی
گوشِ انساں میں انڈیلے گئے دعوے کیا کیا

لفظ کِس شان سے تخلیق ہوُا تھا، لیکن
اس کا مفہوُم بدلتے رہے نُقطے کیا کیا

اِک کرن تک بھی نہ پہنچی مرے باطن میں ندیمؔ
سرِ افلاک دمکتے رہے تارے کیا کیا

اگست ۱۹۷۹ء

☆

بچھڑ کے بھی مَیں ترے پر تو و صال میں ہوُں
جہاں بھی جاؤں، ترے ہا لئہ جمال میں ہوُں

یقیں نہ آئے تو آئینۂ اَنا میں دیکھ!
ترے خیال میں ہوُں، تیرے خدوخال میں ہوُں

ترے بدن کے سبھی گل کھلائے ہیں مَیں نے
لہوُ کی طرح رواں تیری ڈال ڈال میں ہوُں

تری تلاش میں عالم عجب نشاط کا تھا
جو تُو مِلا تو ترے، ہجر کے ملال میں ہوُں

سدا کی طرح تری آرزو کمال پہ ہے
یہ اور بات کہ مَیں عمر کے زوال میں ہوُں

کھُلی فضا کے لیے خاک کا قفس توڑا
مگر ندیمؔ ابھی آسماں کے جال میں ہوُں

اگست ۱۹۷۹ء

☆

نئے انساں کے عجب تیور ہیں
نغمہ بر لب، مگر آنکھیں تر ہیں

لوگ بے چہرہ ہیں، گھر بے در ہیں
عصرِ نو کے بھی وہی منظر ہیں

گُل بدست آئے سبھی راہ نما
ان کے ذہنوں میں مگر پتّھر ہیں

یہ بھی اک طرح کی محکومی ہے
کہ ہم آزاد ہیں۔اور بے پر ہیں

کوئی جینے کا سلیقہ بھی سکھائے
مُجھ کو مرنے کے سبق ازبر ہیں

رائیگاں جائے گا سورج کا عتاب
سبز اشجار مرے اندر ہیں

اُس کو کیا خوف، نہ ہونے کا ندیمؔ
جس کو ہونے کے ہزاروں ڈر ہیں

جولائی ۱۹۷۹ء

☆

قلم دل میں ڈبویا جارہا ہے
نیا منشور لِکھّا جارہا ہے

اُجالے بٹ رہے ہیں قاش درقاش
اندھیروں کو سنوارا جارہا ہے

مَیں کشتی میں اکیلا تو نہیں ہوُں
مرے ہمراہ دریا جارہا ہے

کہیں جمتی نہیں چشمِ تماشا
جو نظّارہ ہے، گزرا جارہا ہے

سلامی کو جھکے جاتے ہیں اشجار
ہوَا کا ایک جھونکا جارہا ہے

قیامت سی بپا ہے شاخ درشاخ
شجر سے ایک پتّا جارہا ہے

مسافر ہی مسافر ہر طرف ہیں
مگر ہر فرد تنہا جارہا ہے

شبِ فرقت کے تارے بُجھ رہے ہیں
صدی کا ساتھ چھُوٹا جارہا ہے

مَیں اکِ انساں ہوُں یا سارا جہاں ہوُں
بگولا ہے کہ صحرا جارہا ہے

رواں ہوُں مَیں ستارہ در ستارہ
زمیں پر میرا سایہ جارہا ہے

ندیمؔ اب آمد آمد ہے سحر کی
ستاروں کو بجھایا جارہا ہے

جولائی ۱۹۷۹ء

☆

اگر فرشتہ مرے غم سے آشنا ہو جائے
زمیں، مدار سے ہٹ کر کہیں ہوا ہو جائے

تنا ہوُا ہے مرے چار سُو وہ سنّاٹا
کہ جس میں سانس بھی بھونچال کی صدا ہو جائے

یہ معجزہ ہے مرا، یا مرے ضمیر کا زہر
مَیں شاخِ گُل کو جو چھُولوں، تو اژدہا ہو جائے

بہت سا قرض مشیّت کا ہے مرے سر پر
مَیں سر ہی کیوں نہ کٹا دُوں کہ کچھ ادا ہو جائے

بقا اسی کو تو کہتے ہیں، جب کوئی انساں
برائے عظمتِ انسانیت، فنا ہو جائے

نہ ہو سکا کبھی عریاں کوئی دریدہ لباس
خود اپنا خون ہی منصور کی قبا ہو جائے

وفورِ فصلِ بہاراں کا ہے شہید وہ پھُول
کہ جس سے بو کی طرح، رنگ بھی جُدا ہو جائے

دیا جلے تو کرے گھر کے بام و در روشن
جو گھر جلے تو اندھیرے کی انتہا ہو جائے

مرض ہی حریّتِ فکر کا کچھ ایسا ہے
کہ جو بھی فکر کرے، اس میں مُبتلا ہو جائے

اگر بتاؤں کہ مَیں سوچتا ہوُں کیا کیا کچھ
نظامِ کون و مکاں، جانے کیا سے کیا ہو جائے

تنا ہے تابہ ابد میرا دشتِ تنہائی
ندیمؔ اب تو مرا، ہمسفر خدا ہو جائے

مئی ۱۹۷۹ء

☆

صرف اک عزمِ سفر، زادِ سفر اپنا تھا
کبھی صحرائے تمنّا میں گُزر اپنا تھا

مَیں اگر دشت سے گزرا، تو وطن سے گُزرا
گھر جو بے در نظر آیا، وہی گھر اپنا تھا

میرے حصّے میں فقط نکہتِ آوارہ تھی
نہ چمن، اور نہ کووئی گُلِ تر اپنا تھا

خُود کو آئینے میں دیکھا تو مَیں مانندِ چراغ
اپنے ہی ہاتھ پہ رکھے ہوُئے سَر اپنا تھا

حُسن سے یوُں تو فرشتے بھی اثر لیتے ہیں
فرق یہ ہے --- مرا اندازِ نظر اپنا تھا

سب پہ طاری تھا طلسمِ رُخ، زیبا، لیکن
مَیں جو بے چین تھا اتنا، مجھے ڈر اپنا تھا

یوُں تو تاحدِّ نظر اوج پہ تھی شعلہ زنی
جس نے اس گھر کو جلایا، وہ شرر اپنا تھا

آج وہ مجھ پہ بڑھا طعن بہ لب، سنگ بدست

اور اِک روز وہی آئنہ گر اپنا تھا

جو بھی سُنتا ہے، سمجھتا ہے، وہ خود بولا ہے
بات اس طرح سے کہنا ہی ہُنر اپنا تھا

پیش غیروں کی طرح آئے ہیں اپنے بھی ندیمؔ
کوئی اپنا تھا تو اندر کا بشر اپنا تھا

مارچ ۱۹۷۹ء

☆

طوفاں ہے اگر گھر کے درپے، یوں بیٹھ نہ جاؤ، کچھ تو کرو
کھڑکی کے شکستہ شیشے پر کاغذ ہی لگاؤ، کچھ تو کرو

انساں کے قبضۂ قدرت میں اک نطق نہیں ہے، بہت کچھ ہے
ہونٹوں سے نہ نِکلے بات اگر، آنکھوں سے سُناؤ، کچھ تو کرو

محرُومِ تمنّا رہنے کا سنّاٹا کھا جائیگا تمھیں
مایوُسی کے سکتے سے بچو، آنسوُ ہی بہاؤ، کچھ تو کرو

سُلطان کے قصرِ مرمر کا دروازۂ آہن بند سہی
گر توڑ نہیں سکتے اس کو، زنجیر ہلاؤ، کچھ تو کرو

اے جلتے ہوئے گھر کے لوگو! شعلوں میں گھرے کیا سوچتے ہو
جب آگ بجھانا مشکل ہے، باہر نِکل آؤ، کچھ تو کرو

یہ کھیت جو چُپ ہیں، بولیں گے، اور اکھوے آنکھیں کھولیں گے
بارش نہ سہی، بجلی ہی سہی، کچھ تو برساؤ، کچھ تو کرو

مارچ ۱۹۷۹ء

☆

اپنے خوابوں کے کئی ارض و سما لے جائے گا
قبر میں انسان کی اس کے سوا لے جائے گا

وقت کا طوفاں ہے حسن و سر خوشی کی تاک میں
دل سے جذبہ، ہاتھ سے رنگِ حنا لے جائے گا

پھوُل کی میّت پہ کیوں سارا چمن ہے سینہ زن
کوئی جھونکا آئے گا، اس کو اُٹھا لے جائے گا

آدمی کے دَم سے آئینِ مشیّت زندہ ہے
مر گیا تو ساتھ ہی اپنا خدا لے جائے گا

موجۂ بادِ صبا کی ہمسر ہی اچھی۔۔۔مگر
یہ تو ہر جانب تری آوازِ پا لے جائے گا

کوئی دیوانہ بکارِ خویش دیوانہ نہیں
نقشِ پا دے جائے گا اور آبلہ لے جائے گا

داورِ محشر کے ہاں، عصرِ رواں کا حکمراں
خُون میں ڈُوبی ہوئی اک فاختہ لے جائے گا

اپنی بستی میں تو ہیں سب لوگ خوابیدہ ندیمؔ
اور کس کے در پہ کشکولِ صدا لے جائے گا

فروری ۱۹۷۹ء

☆

طیور سے نظر آتے ہیں جو درختوں پر
فضا کے پھُول ہیں جو کِھل رہے ہیں شاخوں پر

عجیب حُسنِ مساوات ہے، کہ یکساں ہے
نوازش اوس کی، پھُولوں پر اور پتّوں پر

وہ جا چکا، مگر اب تک برستا رہتا ہے
اسی کا عکسِ شفق رنگ میری شاموں پر

مَیں ایک پَل بھی جو بھُولوں اسے تو مر جاؤں
اسی کے پیار کا پہرہ ہے میری سانسوں پر

زمیں کے غنچہ و گُل ہی تو ماہ و انجم ہیں
ستارے کس نے اُتارے کسی کے قدموں پر

ندیم مُجھ کو فرشتے سمجھ نہ پائیں گے
مَیں مشتمل ہوُں ہزاروں لطیف جذبوں پر

------☆------

عجیب وقت پڑا، اب کے با ضمیروں پر
لبوں پہ پھُول ہیں لیکن پہاڑ سینوں پر

خدا کرے، سفرِ عشق شب کو بھی نہ کٹے
اندھیرا ہاتھ نہ رکھ پائے میری آنکھوں پر

مَیں روشنی کی گُزر گاہیں کیوں کروں مسدود
غلاف کون چڑھاتا پھرے دریچوں پر

عجیب چیز ہے انساں! عجیب اس کا خمیر!
عجیب رنگ کا سبزہ اُگا ہے قبروں پر

یہ کائنات--بغیرِ حیات--بے مفہوم

قدم زمین پہ رکھو، نظر ستاروں پر

ابھی خزاں مرے آنگن میں خیمہ زن ہے ندیمؔ
مگر پڑوس میں پھُول اُگ رہے ہیں بیلوں پر

دسمبر ۱۹۷۸ء

☆

خُوش ہوُا ہوُں تو مجھے اشک فشاں ہونے دو
برف پگھلی ہے تو دریا کو رواں ہونے دو

صبح کے عشق میں طے کرنا ہے دشتِ شب بھی
آگ درکار اگر ہے، تو دُھواں ہونے دو

کچھ نہ بولو گے تو گھُل جاؤگے شمعوں کی طرح
اپنی سوچوں کو زباں سے بھی بیاں ہونے دو

سہہ نہ پاؤگے تو خود اس کو جھٹک ڈالوگے
غم کی سِل کو ابھی کچھ اور گراں ہونے دو

تم نہ ہوگے اگر اپنے ہی، تو کِس کے ہوگے
اپنے وجدان پہ یہ راز عیاں ہونے دو

حاکموں سے نہیں، اللہ سے مانگے کی حقوق
میرے گھر کی نئی نسلوں کو جواں ہونے دو

پھُول پَت جھڑ میں جو کِھلتا ہے تو کِھلنے دو ندیمؔ
جو بھی ہونا ہے وہ ہوگا، مری جاں، ہونے دو

دسمبر ۱۹۷۸ء

☆

ٹُوٹتے جاتے ہیں سب آئنہ خانے میرے
وقت کی زد میں ہیں، یادوں کے خزانے میرے

زندہ رہنے کی ہونّیت تو شکایت کیسی
میرے لب پر جو گِلے ہیں، وہ بہانے میرے

رَخشِ حالات کی باگیں تو مرے ہاتھ میں تھیں
صرف مَیں نے کبھی احکام نہ مانے میرے

میرے ہر درد کو اس نے اَبدیّت دے دی
یعنی کیا کچھ نہ دیا مجھ کو خدا نے میرے

میری آنکھوں میں چراغاں سا ہے مستقبل کا

اور ماضی کا ہیولیٰ ہے سرہانے میرے

تُو نے احسان کیا تھا، تو جتایا کیوں تھا
اس قدر بوجھ کے لائق نہیں شانے میرے

راستہ دیکھتے رہنے کی بھی لذّت ہے عجیب
زندگی کے سبھی لمحات سہانے میرے

جو بھی چہرہ نظر آیا، ترا چہرہ نِکلا
تو بصارت ہیمری، یار پرانے میرے!

سوچتا ہوُں، مری مٹی کہاں اُڑتی ہوگی
اِک صدی بعد جب آئیں گے زمانے میرے

صرف اک حسرتِ اظہار کے پر تو ہیں ندیؔم
میری غزلیں ہوں کہ نظمیں کہ فسانے میرے

دسمبر ۱۹۷۸ء

www.HallaGulla.com
Virtual Home for Real People

www.HallaGulla.com
Virtual Home
for Real People

www.HallaGulla.com
Virtual Home
for Real People

www.HallaGulla.com
Virtual Home
for Real People

www.HallaGulla.com
Virtual Home
for Real People